R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت

ٹیلی فون
قیمت فی پرچہ

جلد ۲۵ - شمارہ ۱۰	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۸ مارچ ۱۹۶۶ء

اداریہ

طلبا اور تشدد

آج کل طلبا میں تشدد بڑھتا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ سیاست دانوں نے ان پر اثر جما رکھا ہے اور وہ اپنے اغراض کے لیے ان کو بھڑکاتے ہیں۔ کچھ یہ کہتے ہیں کہ سماج میں اخلاقی قدروں کا احساس کم ہو گیا ہے اور نوجوان جو اس سے زیادہ متاثر ہیں، وہ بے لگام ہو گئے ہیں۔ کچھ کے نزدیک یہ سنیما کا اثر ہے جس میں مار دھاڑ کے مناظر زیادہ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بے روزگاری کے بھوت نے طلبا کو تشدد پر آمادہ کر رکھا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ طلبا کی تعداد برابر بڑھتی جاتی ہے اور ان کی نگرانی کے لیے اساتذہ مناسب تعداد میں موجود نہیں ہیں اس لیے طلبا کی ذہنی تربیت نہیں ہو پاتی۔ غرض آج کل جسے دیکھیے وہ اس تشدد کے اسباب پر رائے زنی کر رہا ہے، مگر اصل مرض کو بہت کم لوگ دیکھتے ہیں اور چونکہ یہ ایک قومی مسئلہ ہے اس لیے ہم اس پر اظہار خیال ضروری سمجھتے ہیں۔

تعلیم کا مقصد طلبا کی ذہنی تربیت اس طرح کرنا ہے کہ ان کی شخصیت کی صحیح خطوط پر تعمیر ہو۔ ان کی صلاحیت اجاگر ہو اور وہ ایک طرف اپنی روزی کما سکیں اور دوسری طرف ان کے پاس ایسی قدریں ہوں جو انھیں اچھا شہری بنا سکیں۔ لیکن موجودہ تعلیم اپنے کسی مقصد میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔ نہ طلبا کی شخصیت کی مناسب خطوط پر تعمیر ہوتی ہے، نہ ان کی پوشیدہ صلاحیتیں ابھرتی ہیں، نہ انھیں روزی ملتی ہے، نہ وہ اچھے شہری کی خصوصیات کے حامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ طریقۂ تعلیم صحیح ہے نہ طریقۂ امتحان۔ طریقۂ تعلیم میں خرابی یہ ہے کہ سارا زور کورس ختم کرنے اور کسی نہ کسی طرح مقررہ حدود کے متعلق طلبا کو معلومات عطا کرنے پر ہے۔ اس پر نہیں کہ طلبا نے واقعی یہ سب سیکھ لیا ہے۔ امتحان کی خرابی یہ ہے کہ سال کے آخر میں ایک پرچے کے ذریعہ سے طالب علم کورس کے ایک حصے کے متعلق جوابات تیار کر لیتا ہے اور پاس ہو جاتا ہے۔ ابتدائی درجوں میں اساتذہ کو تنخواہیں اتنی کم ملتی ہیں کہ وہ نہ طلبا سے اور نہ اپنے کام سے کوئی خاص لگاؤ پیدا کر پاتے ہیں۔ ثانوی درجوں میں تعلیم اور بھی کمزور ہے۔ اس منزل پر کسی چیز کی اچھی بنیاد نہیں پڑتی، نہ زبان کی، نہ علوم کی۔ اعلیٰ تعلیم کی منزل پر بنیاد کمزور ہونے کی وجہ سے، طلبا اساتذہ کے لیکچروں، کتب خانوں، اقامت خانوں سے حقیقی فائدہ نہیں حاصل کر پاتے۔ سماج میں بے اطمینانی ہے۔ سیاست داں جس طرح ووٹ حاصل کرتے ہیں اور ملک میں اخلاق اور ڈسپلن کی جو حالت ہے اس سے یہ طلبا متاثر کیوں نہ ہوں۔ طلبا جانتے ہیں کہ زندگی میں کامیابی کے لیے صلاحیت کافی نہیں، سفارش کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور میں سرمایہ داروں نے کامیابی کے لیے ایسے ہتھیار استعمال کیے ہیں کہ کامیابی کا معیار دھوکہ دھڑی، خود غرضی اور لوٹ کھسوٹ بن گیا ہے۔ ملازمت صرف انجینیری اور ڈاکٹری پڑھنے والوں کے لیے یقینی ہے اور سائنس کے گریجویٹوں کے لیے اس کا امکان ہے۔ آرٹس کے مضامین کے امکانات کی طرف سے سوائے اقتصادیات اور انگریزی کے خاصی مایوسی ہے۔ اس صورت میں فوری تدابیر اور رفوگری یا لیپ پوت کی کوشش سے کام نہ چلے گا، بلکہ کچھ بنیادی کام کرنا ہوگا۔

اس شمارے میں

جب کوئی تجارت کرتا ہے تو آیندہ نفع کی امید میں خاصا سرمایہ لگاتا ہے۔ تعلیم کو اس تجارتی اصول پر بھی نہیں چلایا گیا، حالانکہ تعلیم تجارت نہیں ہے۔ تعلیم کے لیے جس سرمائے کی ضرورت ہے اور اس سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، ان کو ذہن میں رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی منزل سے لے کر اعلیٰ درجوں تک بہت بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ طلبا کی مادری زبان میں ابتدائی اور ثانوی درجے تک تعلیم لازمی ہے۔ مادری زبان کی بنیاد کے بغیر طلبا کی شخصیت کی نشو و نما نہیں ہو سکتی، نہ دوسری زبانوں کی اچھی تعلیم ممکن ہے۔ ہمارے یہاں یہ حال ہے کہ اتر پردیش میں ابتدائی درجے پر اردو اقلیت کے بچوں کی ان کی زبان میں تعلیم کا کافی انتظام نہیں ہے اور سہ لسانی فارمولے کے باوجود طلبا اپنی مادری زبان کو تیسری زبان کے طور پر بھی نہیں پڑھ سکتے۔ پھر اساتذہ کی تربیت ایسی ناقص ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذمے داری پوری نہیں کر سکتے۔ جس گریجویٹ کے لیے سب دروازے بند ہوتے ہیں وہ ثانوی اسکول کا استاد بن جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں انسانی علوم (HUMANITIES) کی تعلیم پر مناسب توجہ نہیں ہے۔ اگر پورے سال تحریری کام پر زور ہو، طلبا کو صرف کورس کے کچھ اجزا ہی نہیں خاصا علم حاصل کرنے کا موقع ملے، اور پاس کرنے اور فیل کرنے کے طریقے بدل دیے جائیں، یعنی کسی مضمون میں فیل ہونے پر سال ضائع نہ ہو بلکہ اس مضمون میں دوبارہ امتحان دینے کا موقع ملے، تو کم سے کم تعلیم کے صحیح اثرات طلبا پر پڑ سکیں۔ پھر سماج کے چلانے والوں کو ملک کے مستقبل میں عقیدہ پیدا کرنا ہوگا، ضبطِ نفس سے کام لینا پڑے گا، قومی مقاصد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا پڑے گی۔ گویا نوجوانوں کے سامنے اچھے نمونے رکھنے ہوں گے۔ تب جا کر نوجوان صحیح راستے پر چل سکتے ہیں۔

شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی سے ایک تحقیقاتی مجلے کی اشاعت

شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے ایک تحقیقاتی مجلہ "قدیم اردو" کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ اس رسالے کا مقصد دکنی یا قدیم اردو کے اہم اور غیر مطبوعہ مخطوطات کو ایڈیٹنگ کے جدید اصولوں کے مطابق مرتب کر کے شائع کرنا ہے۔ قدیم اردو کا پہلا شمارہ جو ڈیمی آکٹیو سائز کے ۴۴۳ صفحات پر پھیلا ہے، چھوٹی بڑی پانچ کتابوں اور دو مضامین پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی جن کے شخصی شغف اور دلچسپی کی وجہ سے اس رسالے کا اجرا عمل میں آیا ہے، اس رسالے کے مدیر عمومی ہیں۔ پہلے شمارے میں حسبِ ذیل کتابیں اور مضامین شامل ہیں:-

۱۔ مینا ستونتی: ملک الشعرا غواصی — مرتبہ ڈاکٹر غلام عمر خاں
۲۔ کلامِ مظفر بیجاپوری: مظفر — مرتبہ جناب ابو نصر محمد خالدی
۳۔ کشف الوجود: سید ولی — مرتبہ جناب اکبر الدین صدیقی
۴۔ پرت نامہ: فیروز بیدری — مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں
۵۔ بکٹ کہانی (بارہ ماسہ): افضل — مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں و ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
۶۔ غزلیات حسن شوقی — از جناب حسینی شاہد
۷۔ دکنی رباعیاں — از ڈاکٹر سیدہ جعفر

خوبصورت ٹائپ میں اور خوشنما ٹائیٹل کے ساتھ شائع ہونے والے اس رسالے کی قیمت تیرہ روپے ہے۔ خریداری کے سلسلے کی جملہ خط و کتابت منیجنگ ایڈیٹر، ڈاکٹر غلام عمر خاں، شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی سے کی جا سکتی ہے۔ (نامہ نگار)

داؤد، آدم جی اور نیشنل بنک آف پاکستان کے ادبی انعامات کا اعلان

کراچی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے اعلان کے مطابق مرحوم جسٹس محمد رستم کیانی کی کتاب "افکارِ پریشاں" پر آدم جی ادبی انعام ۱۹۷۵ء دیا جائے گا۔ اس انعام کی رقم دس ہزار روپیہ ہوگی۔

داؤد ادبی انعام درجہ اول کراچی کے پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی کو ان کی تحقیقی کتاب "محمد حسین آزاد" پر دیا گیا نیز درجہ دوم کا انعام لاہور کے سید نور احمد کو ان کی کتاب "مارشل لا سے مارشل لا تک" پر دیا گیا۔ کتاب ۱۹۱۹ء سے ۱۹۵۸ء تک کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ ان دونوں حضرات کو ۵۰۰۰ ہزار روپے ملیں گے۔

نیشنل بنک کے ادبی انعام ۱۹۷۵ء (سائنس) لاہور کے پروفیسر حمید عسکری کو ان کی کتاب "مادے کے خواص" اور کراچی کے پروفیسر قمر الحسن صدیقی کی کتاب "زراعت اور معاشیات" پر ۵، ۵ ہزار روپے کے انعامات کا اعلان کیا گیا۔

دوسری زبانوں میں ترجمے کے لیے خصوصی انعام ۵ ہزار روپے پروفیسر شبیر علی راجشاہی یونیورسٹی کو ان کی لغت "اردو اور بنگلہ کے مشترک الفاظ" پر دیا گیا۔ انگریزی کتابوں میں ڈھاکہ کے ڈاکٹر نور الاسلام کی کتاب "اے شارٹ ٹرم ماڈل فار پاکستان اکنامی" کو ۵ ہزار روپیے کا انعام دیا گیا۔

بنگالی کتابوں میں ڈھاکہ کے مسٹر عبد الجبار کی کتاب "کھگول پریچے" (تعارفِ علم نجوم) اور مسٹر غلام اعظم صدیقی کی کتاب "پاکستان نے ارتھنیتی" (پاکستان کی معاشیات) پر پانچ پانچ ہزار کے انعامات کا اعلان کیا گیا۔ بنگال کے آدم جی اور داؤد ادبی انعامات کی مستحق کتب کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

(کتابی دنیا کراچی)

> تمام مراسلات اور مضامین صفحے کے ایک طرف اور خوشخط لکھے ہوئے ارسال کیجیے۔

ہما میرٹھی

ایک غلط فہمی

ہماری زبان مورخہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۵ء میں جناب جگن ناتھ صاحب آزاد کا مضمون ایک غلطی کا ازالہ شایع ہوا ہے۔ اس میں علاوہ اور باتوں کے ایک بات توجہ طلب ہے کہ شاکر صاحب شعر کہنے پر قادر نہیں تھے۔ یقیناً جناب آزاد اور ان کے دیگر ہم خیال اصحاب کی غلط فہمی دور کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ شاکر صاحب بذات خود ایک قادر الکلام شاعر تھے۔

منشی پیارے لعل صاحب شاکر میرٹھی ۱۹۰۰ء میں حضرت شوکت میرٹھی شارح شرح غالب (والد حضرت ندرت میرٹھی) کے حلقۂ تلمذ میں آئے تھے اور ان سے اپنی منظومات پر اصلاح بھی لیتے تھے اس کے علاوہ خواجہ عبد الروف عشرت لکھنوی کے جانشین ابوالخیال جناب نادر شاہجہانپوری کو بھی اپنا کلام بعد میں دکھاتے رہے ہیں۔ شوکت میرٹھی اور نادر شاہجہانپوری دونوں نے ہی رتو سنگھار کے منظوم ترجمے اکسیر سخن پر اصلاح دی تھی مولانا شوکت میرٹھی نے اکسیر سخن کی اصلاح کے بعد اس پر اپنے ہاتھ سے یہ سند دی تھی "لاجواب ہے۔ دوسرے کا یہ حوصلہ نہیں اس کو سہل ممتنع کہنا بجا ہے۔" نادر صاحب شاہجہانپوری جن کو وراثت میں میر تقی میر کی جانشینی بھی ملی ہے اپنے ایک خط محررہ ۲۰ر مارچ ۱۹۵۹ء میں اس امر پر روشنی ڈالتے ہیں۔

"جب سے مرحوم شاکر نے زمانہ کانپور سے شایع کیا تھا۔ اس وقت سے وہ برابر اپنے اور دیگر بھی شعراء کے کلام پر مجھ سے اصلاح کروا کے شایع کرتے تھے اور یہی تسلیم اور ان کے والد کو بھی (مدیر زندگی دہلی) ان کا مشورہ تھا۔"

ماہنامہ اخوت لاہور کے یاد رفتگاں نمبر میں جناب پادری امید مسیح صاحب نے بھی اپنے مضمون میں اس کی تائید کی ہے کہ شاکر صاحب مولانا شوکت میرٹھی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

شاکر صاحب اس قدر مشاق شاعر تھے کہ دوسرے بھی ان سے فیض حاصل کر چکے ہیں ان کے ایک مشہور شاگرد پادری ٹامس شیر سنگھ ذاکر میرٹھی تھے۔ سرور کو بھی مشورہ دیتے تھے۔

شاکر صاحب کو نظمیں لکھنے کا ذوق ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا اور ۱۹۰۷ء تک وہ اس میدان میں کافی ممتاز مقام حاصل کر چکے تھے۔

۱۹۰۲ء سے ۱۹۴۱ء تک وہ تقریباً سترہ یا اٹھارہ پرچوں کے ایڈیٹر یا جوائنٹ ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ ان میں سے بیشتر پرچے ادبی اور علمی تھے اور چند مسیحی پرچے بھی تھے کچھ نام یہ ہیں۔

تحفۂ سرحد (بنوں)، زمانہ (کانپور)، مخزن مسیحی، ادیب، تفریح (لکھنؤ)، العصر (لکھنؤ)، زندگی (لکھنؤ)، ستارۂ ہند (لکھنؤ)، استقلال (کانپور)، حریت (کانپور)، سرِ دار (لاہور)، الفرقان (لاہور)، خوش باش (دہلی)، ریاست (دہلی)، ریج (دہلی)، بچوں کی دنیا (الہ آباد)، کوکب ہند (لکھنؤ)

شاکر صاحب نے رتو سنگھار کا ترجمہ ۱۹۱۲ء میں کیا تھا اور اسی برس اسے شایع بھی کروا دیا تھا۔ اس منظوم ترجمے کی کچھ نظمیں ایک دیوالگیر کلنڈر کے کئی ورقوں پر تصنیف ہوئیں جو ۱۹۱۲ء کا ہے ان اوراق پر شاکر صاحب نے منظوم ترجمے کا خاکہ بنایا اور اسے نظم کا قالب دیا۔

شاکر صاحب نے اپنی زندگی کے آخری چالیس برسوں میں تراجم، تصانیف و تالیفات، منظوم تصانیف کی ہیں اور ان کو شایع بھی کرایا ہے۔ جن پرچوں میں ان چالیس برسوں میں ان کا کلام شایع ہوا ہے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

ہمایوں، ادبی دنیا، ادب لطیف، تنویر المشرق، خیام، شمس بنگال، کمال، ندیم، عالمگیر، زندگی، ابابیل، اخوت، نور افشاں، روحانی شعلہ، وغیرہ وغیرہ

۱۹۳۶ء میں شاکر صاحب نے ایک مشہور و معروف ادبی و مذہبی منظوم تصنیف غریب الوطن شاہزادہ بھی کی تھی جو ۱۹۳۸ء میں ہی لاہور سے شایع ہوئی تھی۔

مارچ یا اپریل ۴۲ء میں شاکر صاحب نے ایک غزل کہی تھی جس کے کچھ اشعار یہ ہیں ؎

ہوگیا ہے رفتہ رفتہ یہ اسیری کا مزاج
تھک گئے ہیں بال و پر اور حسرت پرواز ہے
ہے دلوں کی پائمالی میں سرافرازی نصیب
واہ کیا تیرے خرام ناز کا انداز ہے

۱۹۴۲ء میں شاکر صاحب نے کچھ رباعیات بھی کہی تھیں۔

چھلنی ہے خدنگ غم سے سینا کیسا
ہر وقت لہو کے گھونٹ پینا کیسا
یہ بھی کوئی لطف زندگی ہے شاکر
مر مر کے جیئے بھی تو یہ جینا کیسا

ہشیار ہو شاکر کہ یہ پچھتائے گا
کیا روز کے غم سے تو یہ باز آئے گا
ہنس کھیل کے جس طرح جوانی گزری
رو رو کے بڑھاپا بھی گزر جائے گا

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۴۲ء میں شاکر صاحب نے ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

درد و غم، رنج و الم سب سے رہا ہو جائے گا
روح جس دن خانۂ تن سے جدا ہو جائے گی

مئی ۵۲ء میں شاکر صاحب تین غزلیں کہی تھیں ہر ایک غزل کا ایک ایک شعر یہ ہے ؎

اب تک وہ منکرِ جذب عشق ہیں
شاید وہ اعتراف ہمیں دیکھ کر کریں
کہوں کس سے شاکر میں اسرارِ غم
مجھے شک خود ان کی صداقت میں ہے
کروں کیا شکوہ بے مہری اہل جہاں شاکر
کہ دل اب آشنائے ہر جفا معلوم ہوتا ہے

مئی یا جون ۵۳ء میں شاکر صاحب نے ایک اور غزل کہی ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

ہے شکر کی جگہ کہ ہوں خادم مسیح کا
شاکر نگارِ خلق میں ہر چند خوار ہوں

جولائی اگست ۱۹۵۳ء میں انھوں نے ایک نعت بھی کہی ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

طبیب جانِ دہ صوری مسیحا
دوائے دردِ مہجوری مسیحا

اگست ستمبر ۱۹۵۳ء میں انھوں نے ایک اور غزل کہی تھی جس کا ایک شعر ہے ؎

مرگ منزل ہے مگر ہے حیاتِ جاوید
مر بھی جاؤں گا تو سمجھوں گا کہ زندہ ہوں میں

اپریل یا مئی ۱۹۵۳ء میں انھوں نے مسیحیوں کی مقدس کتاب بائبل کے حصۂ نظم کے کچھ ابواب سے چیدہ چیدہ آیات لے کر انھیں منظوم کر دیا۔ ایک نظم آج اور کل کے عنوان سے کہی تھی چند شعر یہ ہیں ؎

گرچہ کشت امل کے بونے میں
دل پہ درد و بار ا ٹوٹا
تخم ریزی اگرچہ کرتے ہیں
اشک ریزی کے ساتھ صبح و مسا
گیت گاتے ہوئے مگر کل ہم
کھیت کاٹیں گے دوستو اپنا

یہ زبور ۱۲۶ کی پانچویں اور چھٹی آیت کا منظوم ترجمہ ہے۔

اسی طرح ان کی ایک اور مشہور نظم شکرِ نعمت بھی ہے۔

الغرض یہ کہنا درست نہیں ہے کہ منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی شعر کہنے پر قادر نہیں تھے۔ انھوں نے باقاعدہ شاعری کی تھی۔ خود شعر کہتے تھے۔ انا پر اپنے استاد سے اصلاح لیتے تھے اور شاگردوں کو اصلاح بھی دیتے ہیں۔

اس بات کا دستاویزی ثبوت ہے کہ ذاکر میرٹھی کے کلام پر شاکر صاحب نے اپنے ہاتھ سے اصلاح دی ہے۔ شاکر صاحب نے اپنی رباعیات اور کچھ اور کلام کی اصلاح کے لیے حضرت نوح ناروی کو بھی منتخب کیا تھا اور اس سلسلے میں حضرت عابد مسیح عابد مرادآبادی بی اے سے خط و کتابت بھی کی تھی۔

یہ بات بھی پردۂ راز میں نہیں ہے کہ وہ سرور کو بھی مشورہ دیتے تھے۔

لکھنؤ میں جب ان کی مالی حالت بے حد خراب و خستہ ہو گئی تھی تو وہ کافی مقروض ہو گئے۔ گوالیار کی ریاست سے بھی کچھ ادھار روپیہ لے لیا تھا۔ دونوں جگہ عدم ادائیگی کی وجہ سے ان پر مقدمہ چلا اور دیوانی میں انھیں سزا ہو گئی۔ مال و اسباب نیلام ہو گیا۔ اس صدمے کی تاب نہ لا کر وہ گوشہ نشین ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے آخری دنوں کے حالات کم لوگوں کو معلوم ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مالی پریشانیوں کی معذوری نے انھیں اپنی تخلیقات کوڑیوں کے مول بیچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی زندگی کے آخری ڈیڑھ برسوں میں انھیں سرکاری وظیفہ بھی ملا۔ لیکن ان کی صحت اور عمر دونوں کے لیے یہ امداد بہت دیر سے ملی تھی اور وہ اچانک موت ہو جانے سے مر گئے۔

ان کی زندگی کے آخری چالیس برس بہت دکھ اور مصیبت کے تھے۔ ان حالات میں جو کچھ انھوں نے لکھ پڑھ لیا وہ بہت غنیمت تھا۔ شاید کوئی اور ہوتا تو ہمیشہ کے لیے گونگا ہو جاتا۔

انجمن کی نئی مطبوعات

۱۔ فائز دہلوی اور دیوانِ فائز	پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب	۵/۵۰
۲۔ گلشن سخن (تذکرہ شعرائے اردو)	" "	۶/
۳۔ روز نگار شرح سودا اور زند	مترجمہ ابوسالم	۸/۵۰
۴۔ کلام سودا	ڈاکٹر شمس الدین صدیقی اسلام	۶/
۵۔ تنقیدیں (جدید ایڈیشن)	"	۶/
۶۔ بازدید	ڈاکٹر شعیب الرحمٰن	۳/۵۰

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

غزل

فراق گورکھپوری

۱۴ر فروری کو سنیچ بہادر سپرو اسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں فراق داخل ہوئے اور ۱۹ر فروری کو اسی اسپتال میں انھیں ہرنیہ کا نشتر دیا گیا۔ اب سے پورے ۳۲ برس پہلے اسی اسپتال میں غشی کی حالت میں فالیریا کا آپریشن کیا گیا تھا جس سے جانبر ہو کر فراق نے اسی اسپتال میں اپنی مشہور نظم "شام عیادت" کہی تھی۔ اس بار نشتر کے بعد جب طبیعت سنبھلی تو مندرجہ ذیل غزل انھوں نے بستر علالت پر کہی۔

وہ ساز شب کی سمع نوازی نہیں رہی
اب داستاں نہ وہ خوشی نہیں رہی[1]

ترکی چھٹے کہ چھٹ گئے ہم اپنے آپ سے
اب اپنی زندگی بھی تو اپنی نہیں رہی

وہ شام انتظار کی بے تابیاں کہاں
شب ہائے غم میں بھی وہ درازی نہیں رہی

اب عشق میں وہ شوق شہادت نہیں رہا
اب تیغ ناز میں بھی وہ تیزی نہیں رہی

اب تیری یاد سے بھی تو محروم ہو گئے
اب غم کی زندگی بھی ہماری نہیں رہی

اب عشق میں وہ ذوق نظارہ نہیں رہا
اب حسن میں وہ جلوہ فشانی نہیں رہی

مجھ میں بھی صبر و ضبط کا یارا نہیں رہا
احباب میں بھی تاب تسلی نہیں رہی

بیگانہ وار دیکھتے مجھ کو گزر گئے
اب تو مری نظر بھی ضرورت نہیں رہی

آپس میں لوگ دشمن دوست آج بھی ہیں
لیکن وہ اب دلوں کی صفائی نہیں رہی

تیرے دلوں میں کس لیے اب بھی اداس ہے
تو تیرگی شام غریبی نہیں رہی

ہم زندہ ہیں ضرور مگر اس کو کیا کریں
اب زندگی شریک ہماری نہیں رہی

اے دوست تیرے جو سلسلے تھے ہیں تمام
اب تک ابھی جو تھی وہ کوئی بھی نہیں رہی

تم سو طرح سے آج بھی ہو مہرباں مگر
مجھ پر وہ اب نگاہ تمہاری نہیں رہی

یکساں بسر ہوئی زندگی کسی کی زمانہ میں
دنیا ہے یہ ہمیشہ کسی کی نہیں رہی

اب عشق یار کے وہ حجاب نہیں رہے
اب حسن کی وہ عشوہ طرازی نہیں رہی

تا حشر تاکہ پھیری نگاہ کب نگاہ
جب دل سے دل میں کوئی جوانی نہیں رہی

کیا کیا مرا کاڈ پڑے لگا تیری راہ میں
اے عمر تجھ میں بھی وہ روانی نہیں رہی

ہم جب کے منتظر تھے ہے بات ہی کچھ اور
اب تو تری نگاہ بھی تیری نہیں رہی

یوں تو وہ ایک خواب کی صورت گزر گئے
یوں تو کسی کی آنکھ بھی سوئی نہیں رہی

سب کچھ نثار دے جو بس ایک نیم ناز پر
عشاق میں وہ ہمت عالی نہیں رہی

کرتے تھے جس پہ رشک زمانے کے پختہ کار
اے دل وہ تیری خام خیالی نہیں رہی

کیسے جب گردش افلاک میں خلل
روئے فضا پہ بھی وہ بحالی نہیں رہی

کس وقت روز حشر ہوا فیصلہ مرا
دوزخ میں بھی جگہ کوئی خالی نہیں رہی

جب ہمارے ساتھ گئے بیمار مر گئے
ہم کو بھی زندگی میں کشش سی نہیں رہی

جس دم فراق بزم سخن سے میں اٹھ گیا
تب سے غزل بھی کچھ معانی نہیں رہی

---

[1] اس مطلع میں شاعر نے ایطا کو جائز رکھا ہے

—۵—

جگر کشن چودھری حبیب

غالب

شاعر ہندوستاں اے شاعر جادو بیاں
ہند کے خم خانۂ عرفاں کے اے پیر مغاں

تیرے نغموں میں نشاط زندگی کی ہے جھلک
کیف ہے انگل کا تبسم ذکر دل حسن بتاں

تیرے نغموں میں دل انساں کا ہے سوز و گداز
جن سے یکسر ہے عبارت زندگی کی داستاں

ہے خیال و فکر کی دنیا ترے ہر لفظ میں
تیرا اشعار ہے کتنا حسیں کتنا جوان

تیری نغموں نے ٹٹولا ہے مزاج انساں کا
میرے دل کا راز مجھ پر ہی کیا تو نے عیاں

تو نے ہر انساں کو دکھلایا زندگی کا تیہ
جس کی ہے حد نظر تک تجلیاں ہی تجلیاں

فیض سے تیرے ہی ہے اردو کا یہ حسن جواں
تیرے باعث ہی ہے وہ رونق بزم جہاں

تیرے نغموں کو کبھی بھی موت آ سکتی نہیں
تا زمان ان کی کشش ہے ان کی تابانی وہی

تیرے علم و فن کی شہرت ہے ہر سو ہم حبیب
جگ گیا ہے دہر میں تیرے [illegible] جہاں

وحید الدین شیخ

سحر

دل کے ہاتھوں سے مجبور ہو کر
ان کی پرچھائیاں ڈھونڈھتا ہوں
تازگی اس کو ملتی ہے ان سے
تشنگی اس کو ملتی ہے ان سے
ساز غم چھیڑتی ہیں یہ پیہم
روح مسرور ہوتی ہے میری
خون بہتا ہے جن جن کے پانی
دور ہوتی ہے من کی کثافت
دل میں آتے ہیں یوں وہ سنور کر
جاگ گئی ہے تخیل کی دنیا
کھلتے ہیں تفکر کے سوتے
لے کے ادراک کا پھر سہارا
آنے والے زمانے کی باتیں
دیکھتا ہوں دکھاتا ہوں پیہم
ان کی مجبوریاں جب چھٹی ہیں
میری مایوسیاں جا رہی ہیں
ساز دل سے یہ آتی ہے آواز
آج پھر سے سحر ہو رہا ہے

ابو علی

لالہ لاجپت رائے اور اون کی صد سالہ سالگرہ کمیٹی

صدق جدید لکھنؤ کے ذریعہ یہ معلوم ہوا ہے کہ لالہ لاجپت رائے کی صد سالہ سالگرہ کمیٹی نے اون کی قومی و ملی و سیاسی خدمات کی یادگار میں، ان کی تقریروں کے تین مجموعے شایع کیے ہیں، ایک انگریزی میں، ایک ہندی میں، اور ایک مرہٹی میں، انگریزی میں اون کی تقریروں کا جو مجموعہ شایع ہوا ہے، وہ اس لحاظ سے یقیناً بہت ضروری تھا، کہ لالہ جی کی زندگی کا ایک بڑا حصہ امریکہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں گزرا ہے اور انھوں نے مختلف تقریبوں، جلسوں، اور انجمنوں میں جو تقریریں کی ہوں گی یقیناً اپنے سامعین کی رعایت سے انگریزی ہی میں کی ہوں گی، اس لیے ان کا جمع کر لینا تو بہت ضروری تھا، اور یہ کام انجام دے کر سالگرہ کمیٹی نے ایک بڑی ادبی و قومی خدمت انجام دی ہے، جس کے لیے وہ تمام وطن پرستوں اور لالہ لاجپت رائے کے امریکی و یورپی قدردانوں کے شکریہ کی مستحق ہے، لیکن اون کی تقریروں کا ہندی اور اس سے بڑھ کر مرہٹی میں شایع کرنا تو عجیب بات ہے اگر وہ مرہٹہ قوم اور مرہٹی جاننے والوں کے استفادہ کے خیال سے مرہٹی میں شائع کی گئی ہیں، تب تو ٹھیک ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مرہٹی تو الگ رہی جو باوجود بہت زیادہ علمی و ادبی حیثیت سے سرمایہ دار ہونے کے، مہاراشٹر کے حدود سے باہر کہیں بولی اور سمجھی نہیں جاتی، خود ہندی زبان سے جس کو موجودہ دور میں اردو کے سارے حقوق، اور اس کی ہمہ گیری کو نظر انداز کر کے، ملک کی واحد سرکاری اور بین الملی زبان بنا دیا گیا ہے، لالہ لاجپت رائے کا دور و قریب کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا، اور نہ ساری عمر جہاں تک ہم تحقیق کر سکے ہیں، انھوں نے کبھی ہندی یا مرہٹی میں کہیں تقریر کی، نہ اون کے دور کے کسی اخبار میں اس کی رپورٹ شائع ہوئی، اون کا مشہور اور کثیر الاشاعت اخبار بندے ماترم بھی جس کی پورے ہندوستان میں بڑی دھوم تھی، اور سیاسی و قومی حلقوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا، جس کے خیالات، افکار اور آراء کا بڑا وزن محسوس کیا جاتا تھا، شستہ و رفتہ اردو میں نکلتا تھا، انھوں نے اپنے اس مقبول عام اردو اخبار کے ذریعہ اردو کی بڑی خدمات انجام دی ہیں، اور اس کی آواز لندن و امریکہ تک پہنچا دی جہاں اون کا اخبار جاتا تھا، وہ جلسوں، کانفرنسوں اور تقریبوں میں بھی تقریریں نہایت فصیح و بلیغ بلکہ عربی و فارسی آمیز اردو میں کرتے تھے، اور سامعین اور دوسرے ارباب ذوق اون کو سن کر بیحد محظوظ ہوتے تھے، اور صدائے تحسین و آفریں بلند کرتے تھے، اردو کے ذوق اور خدمت کے لحاظ سے وہ ڈاکٹر سپرو، دتاتریہ کیفی، دیا نرائن نگم اور پریم چند جیسے اردو کے ہندو ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی صف کے آدمی تھے، جو اردو ہی میں سوچتے تھے، اور زیادہ تر اردو ہی میں لکھتے تھے، کانگرس کی تحریک آزادی کے شروع سا میں، امریکہ، یورپ، اور برما میں ایک طویل عرصہ کے قیام کے بعد ہندوستان واپس آئے، تو اون کا اپنے وطن میں بہت شاندار خیر مقدم ہوا، اور اون کی آمد کے شور سے سارا ہندوستان گونج گیا، اون کی اس غیر معمولی مقبولیت، اور ہر دلعزیزی کو دیکھ کر کانگرس کے اسپیشل اجلاس کا جو ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں منعقد ہوا تھا، اون کو صدر منتخب کر لیا گیا، میں اس زمانہ میں بسلسلۂ تلاش معاش کلکتہ میں مقیم تھا، میرے جیسے کم سرمایہ کا جس کا ابھی تک کوئی ذریعہ معاش نہیں پیدا ہو سکا تھا، کانگرس کا کم سے کم ٹکٹ بھی ۵ روپئے تھا، لیکن اسی کے پنڈال میں خلافت کانفرنس کا بھی جو ہندوستان کی قومی زندگی میں کانگرس کے دوش بدوش چل رہی تھی، اجلاس ہونے والا تھا، مجھے اتفاق سے ایک کرم فرما کے ذریعہ اوس کا ٹکٹ مل گیا، رات کا وقت تھا، اور پورا پنڈال کھچا کھچ آدمیوں سے بھرا ہوا تھا، جس میں قدرتی طور پر اکثریت مسلمانوں کی تھی، لیکن ڈائس پر اوس وقت کے کانگرس کے تمام سرکردہ لیڈر جلوہ فرما تھے، ان میں سے جو بھی تقریر کے لیے اٹھتا تھا، اوس کا باقاعدہ تعارف کرایا جاتا تھا، ان میں تین بزرگوں کی یاد اب تک باقی رہ گئی ہے، ایک مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر روزنامہ زمیندار لاہور، دوسرے مولانا ابو الکلام آزاد اڈیٹر الہلال کلکتہ، تیسرے یہی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی یعنی انجمن خدام ہند کے بانی اور رکن رکین لالہ لاجپت رائے تھے، جن کا اوس وقت ہر شخص کی زبان پر نام اور ہر محفل میں چرچا تھا، انھوں نے فضائل و برکات اسلام اور مسئلہ خلافت پر اردو میں ایسی فصیح و بلیغ اور ولولہ انگیز تقریر کی، کہ سارا مجمع عش عش کر گیا، اون کی تقریر فصاحت و بلاغت، برجستگی، روانی، اور زور بیان میں کسی طرح مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابو الکلام سے کم نہیں تھی، جن کی بے پناہ خطابت اور سحر بیانی کی اوس وقت سارے ملک میں دھوم تھی، آج تک سامعہ اوس کی یاد سے جھوم رہا ہے۔

ضرورت ہے کہ اون کی اس طرح ملی و قومی و سیاسی تقریر ان کا مجموعہ اسی اہتمام کے ساتھ اردو میں بھی شایع کیا جائے جو اون کی مادری زبان ہونے کے ساتھ ساتھ اون کی صحافتی، علمی اور تصنیفی زبان بھی تھی، اور وہ زیادہ تر تقریر و تحریر کے ذریعہ اسی میں اظہار خیال فرماتے تھے ہیپل سوسائٹی انھوں نے لاہور میں، جو اون کا وطن تو نہیں قومی و سیاسی و صحافتی سرگرمیوں کا مرکز تھا، ہیپل سوسائٹی قائم کی تھی اوس کا سارا لٹریچر اردو ہی میں شائع ہوتا تھا، وہ اردو کے ساتھ غالباً اسی نام کا ایک انگریزی اخبار بھی نکالتے تھے۔ اس لیے اردو داں طبقہ جس سے اون کا براہ راست زندگی بھر تعلق تھا، اور وہی ان کا مخاطب اصل

(باقی صفحہ ۱۰ کالم ۲)

مراسلات

جواب استفسار

ہماری زبان (۲۲ر دسمبر ۱۹۶۵ء) صفحہ ۸ پر عابد کیفی صاحب کا سوال تھا کہ یہ شعر بحرِ بسیط کا ہے یا بحرِ منسرح کا ؟

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

اس کا معقول جواب ۱۵ر جنوری ۱۹۶۶ء کے شمارہ میں سراج ادیبی صاحب نے دیدیا۔ لیکن عابد صاحب کا اتنا سوال پھر بھی باقی رہ گیا کہ "اس کی جانچ کا کیا معیار ہے۔"

یعنی عابد صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر یہ شعر دونوں بحروں میں تسلیم کر لیا جائے تو ترجیح کس بحر کو دی جائے اور کیوں ؟

ترجیح بھی سراج صاحب کی تحریر سے صاف ظاہر ہے شاید وہ لکھنا ہی بھول گئے کہ ترجیح بحرِ بسیط کو ہے یا عمداً گریز کیا ہو کیونکہ شعر صرف ایک ہے اگر پوری نظم ہوتی تو کہا بھی جا سکتا تھا کہ کس بحر میں ہے۔

گلبانگ صفحہ ۳۱ پر غزل ہے اس کے زیرِ عنوان (بسیط و منسرح) لکھا ہے اسی کا ایک شعر یہ ہے

وہ ہے حقیقت نگر کچھ ہے اسی کو خبر
جس نے مئے عشق پی پی کے نہ غوغا کیا

میرا اصل شعر اس طرح تھا۔

وہ ہے حقیقت شناس اس کو ہی کچھ ہے خبر
جس نے مئے عشق پی پھر بھی نہ غوغا کیا

جب حضرت صفی لکھنوی کی خدمت میں غزل لے کر حاضر ہوا تو انھوں نے غزل رکھ لی (وہ اس وقت بیمار تھے) میں چار دن کے بعد پہنچا تو غزل کے ہر شعر پر صاد (ص) بنا ہوا تھا اور اس شعر پر مذکورہ ترمیم تھی۔

فرمایا اوپر بسیط و منسرح لکھا ہے اس لیے شناس کا سین سنبھالنے کے لیے "اس کو ہی" لائے ہو۔ "ہی" حرفِ حصر کو اس سے وابستہ کر دو تو "اسی" ہی کو کچھ ہے خبر" بنا لیکن اہلِ زبان "اس ہی" کی جگہ "اسی" بولتے ہیں اور اگر مصرع اس طرح رہتا۔

"وہ ہے حقیقت شناس کچھ ہے اسی کو خبر"

تو زیرِ عنوان سے لفظ بحرِ بسیط اڑ جاتا۔ اس لیے حقیقت شناس کی جگہ حقیقت نگر لکھا ہے۔ اب شعر صاف ہو گیا۔

(دادا استاد) حضرت صفی لکھنوی کے فرمان اور دیگر ماہرانِ عروض کی تحریروں سے یہ ثابت ہے کہ اگر اس وزن میں کہیں فاعلات وسطی واقع ہوگا تو تمام نظم یا غزل بحرِ منسرح سے متعلق ہوگی۔ ورنہ

یہ وزن مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

جس بے تکلفی سے ہم بحرِ بسیط سے حاصل کر سکتے ہیں بحرِ منسرح سے نہیں، کیونکہ بحرِ منسرح میں ثانی مصرع چار جگہ زحافِ طے اور دو جگہ زحافِ کسف اور چاروں ارکان میں چار تبدیلیاں بارکانِ مستقلہ کے بعد یہ وزن حاصل ہوتا ہے۔ اور بحرِ بسیط میں صرف دو جگہ زحافِ طے (مستفعلن میں) اور دو ہی ارکانِ مستقل سے تبدیلی کرنا پڑتی ہے یعنی دس اور چار کی نسبت ہے۔

عروض کا یہ مسئلہ اصول ہے کہ جو وزن کم سے کم زحافات و تغیرات کے ذریعہ جس بحر سے حاصل ہو اس وزن کی صحیح بحر وہی ہے۔

حافظ شیرازی کا مطلع ہے

دلبرِ جانانِ من بردہ دل و جانِ من
بردہ دل و جانِ من دلبرِ جانانِ من

اس میں کہیں فاعلن کی جگہ فاعلات نہیں آیا لیکن اسی غزل کا یہ شعر ہے۔

سروِ گلستانِ من قامتِ دلجوئے تست
قامتِ دلجوئے تست سروِ گلستانِ من

یہاں دوسرے مصرع میں جوئے تست فاعلات کے وزن پر ہے اس لیے یہ غزل بحرِ بسیط میں نہیں بلکہ بحرِ منسرح میں ہے ظہوری کے دو شعر دیکھئے۔

بند نقابے کشم تیغ و ترنج آوردم
یوسف و یعقوب را کفِ ببریدن دہم

اس میں فاعلات وسطی کہیں نہیں لیکن دوسرا شعر ہے

غرق میرد مرو پیش دست نگہداشت زخم
در پسِ زانوے جیب لب بگزیدن دہم

اس میں فاعلات (دمِ پیش) (زانوے جیب، درمیانی) موجود ہے اس لیے پوری غزل منسرح میں لکھی جائے گی۔

میر تقی میر ہے

میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے
نامِ خدا ہو جوان کچھ تو کیا چاہیے

یہ شعر بحرِ بسیط کا ہے لیکن جوان کی جگہ جوان (بروزن مفعلن) پڑھیں تو پھر بحرِ منسرح کا ہے

ناسخ لکھنوی کا مطلع ہے

تیر رہا ہے کمر، وہ بتِ شنگ آب میں
جس نے نہ دیکھے ہوں سو دیکھے شنگ آب میں

مطلع میں فاعلن وسطی ہے لیکن اسی غزل میں تین جگہ فاعلات وسطی آیا ہے اس لیے پوری غزل بحرِ منسرح میں شامل ہوگی مقطع دیکھئے۔

ناسخ مہجور اگر جا کے نہانے لگے
آئیں نظر سب حباب چشمِ پُر آب میں

شیخ ولایت علی گویا شاگرد جرأت ؎

میں نے کہا آ صنم
اپنے نہ گھر جا صنم
تو ہے خفا کیا صنم
میری قسم کھا صنم

محقق طوسی کی رائے یہ ہے کہ اگر ایک سبب ساقط ہو تو لطیف ہو جاتا ہے جیسا گویا کا مطلع مذکورہ۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ مطلع بحر بسیط سالم (مستفعلن فاعلن) اور بحر بسیط مطوی (مفتعلن فاعلن) دونوں پر تقطیع ہو سکتا ہے۔

(منشی عشق آبادی)

کچھ "جھنگی کتابوں کا کم خرچ سلسلہ" کے بارے میں

اپنے مضمون "جھنگی کتابوں کا کم خرچ سلسلہ" (ہماری زبان ۲۲ دسمبر ۱۹۶۵ء) کے سلسلہ میں ۲۲ جنوری ۱۹۶۶ء کے "ہماری زبان" میں عباس ازل صاحب کا اعتراض "چچا چھکن اور امتیاز علی تاج" پر پڑھا۔ انھوں نے یہ انکشاف فرمایا ہے کہ "چچا چھکن جیروم کے انکل پوجر کا اردو چربہ ہے۔" اتفاق سے جیروم کے متعلق خود امتیاز علی تاج کو بھی معلوم تھا چنانچہ انھوں نے "چچا چھکن" کے دیباچہ میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے۔ عباس ازل صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ "چچا چھکن نے تصویر ٹانگی" اور دوسرے مضامین جیروم کے Uncle Podger Puts The Picture وغیرہ سے مکمل طور پر ماخوذ ہیں اور ادبی سرقہ کی ایک اچھی مثال ہیں۔" مجھ میں نہیں آتا ان کے اس بیان کو صحیح تسلیم کیا جائے یا امتیاز علی تاج کے اس بیان کو کہ "... مذکورہ کتاب میں ایک دوسرے مضمون کے لیے بہت تھوڑا سا مواد موجود تھا۔ اس میں بیشتر باتیں خود شامل کر کے میں نے دوسرا مضمون "چچا چھکن نوچندی دیکھنے چلے" لکھ دیا۔" جن لوگوں نے "تھری مین ان اے بوٹ" پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ امتیاز علی تاج نے اختصار کی حد کر دی ہے۔ کتاب کے صرف چند جملوں اور فقروں پر انھوں نے مذکورہ مضمون کا شاندار اور ہر لحاظ سے مکمل پیکر تیار کیا ہے۔ اب رہی "دوسرے مضامین" کی بات، تو امتیاز علی تاج کا جملہ اوپر نقل کر دیا گیا ہے کافی دلیل ہے اس بات کی کہ یہ "دوسرے مضامین" انھیں کے طبع زاد ہیں۔ دیباچہ غور سے پڑھنا چاہیے۔

عباس ازل صاحب اگر یہ لکھتے کہ تاج نے جیروم سے متاثر ہو کر چچا چھکن کی تخلیق کی تو اہل انصاف کے نزدیک مستحسن ہوتا۔ چچا چھکن بھی اسی طرح خالص ہندوستانی ہیں جس طرح خوجی "خالص ہندوستانی" ہیں۔ سبھی جاننے والے جانتے ہیں کہ خوجی کا کردار بھی طبع زاد نہیں ہے۔ مدیر "نیرنگ خیال" کے اصرار پر تاج نے جیروم کے انکل پوجر کو "چچا چھکن" بنا کر اردو میں لکھ دیا تھا تو پنڈت رتن ناتھ ہجر کی فرمائش پر سرشار نے اسپین کے مشہور مصنف سروانٹیس کی "ڈان کوئکزوٹ" پڑھی، پھر اس کا ترجمہ انھوں نے "خدائی فوجدار" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب سرشار کے مطالعے میں رہی۔ ڈان کوئکزوٹ کے رفیق "سیفو پانزا" کو پڑھیے اور میاں آزاد کے رفیق خوجی کو دیکھیے۔ فرق صرف یہ نظر آئے گا کہ سیفو پانزا اسپینی ہے اور اسی ماحول کا نمائندہ ہے اور خوجی ہندوستانی اور وہ بھی لکھنوی ہے اور اسی ماحول کا نمائندہ ہے۔ اس طرح عباس ازل صاحب کے الفاظ میں خوجی بھی سرقہ ہے۔ صاحب موصوف نے چچا چھکن کے مضامین کو ادبی سرقہ کی ایک اچھی مثال لکھ کر سخت ظلم کیا ہے۔ دراصل ہم لوگ "سرقہ" کا تعین کرنے میں ہمیشہ افراط و تفریط سے کام لیتے ہیں، اکثر استفادے کو بھی سرقہ کی تعریف میں لے آتے ہیں۔ حالانکہ اگر ادبی استفادہ نہ ہوتا رہے تو ہمارے نقادوں کی اصطلاح میں ادب میں "جمود" طاری ہو جائے۔

بات یہ ہے کہ بعض مضمون اور خیالات ایسے عام اور فطری ہوتے ہیں کہ بغیر کسی کاوش کے مختلف ادوار میں مختلف اذہان میں آجاتے ہیں۔ شاعر یا ادیب اپنی بدیع الاسلوبی سے اسی عام خیال یا مضمون کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ مثلاً سعدی کا شعر ہے ؎

گفتہ ام بہ خوباں دل من، خردہ مگیر — کہ ہمیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

حافظ نے یہی مضمون یوں نظم کیا ہے ؎

من اگر عاشقم و رندم و سیہ نامہ سیاہ — ہزار شکر کہ یاران شہر بے گنہ اند

سعدی ہی کا ایک شعر ہے ؎

ای بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم — تو عشق گلی داری من عشق گل اندامی

حافظ نے کیسے غضب کا مطلع بنایا ہے ؎

بنال بلبل اگر با منت سر یاری ست — کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری ست

اردو کے ایک شاعر نے اسی مضمون کو یوں کہا ہے اور خوب کہا ہے ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

یہ مثالیں استفادہ کی تھیں۔ سرقہ کا لفظ استعمال کرنا سوئے ادب ہے۔ ورنہ اس کی مثال میں ولی کا یہ شعر ہے ؎

دیا ہے اگر تیرا خیال نہیں لیا — مشکل ہے جیوں سوں تجھ کوں (کرہاں) با تقیید

جسے نظیری کے اس شعر کے ساتھ رکھ کر پڑھنے میں تو اردو کا خیال بالکل خوش فہمی لگے گا۔

نہ جاں گرفتہ ام بجا بہ بیان جان شیریں — کہ تواں ز دو جہاں را ز ہم امتیاز کردن

یہ دو تین شعری مثالیں وقت اور جگہ کی قلت کے پیش نظر دی گئی ہیں ورنہ نثر میں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ بہرحال ان کی روشنی میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ چچا چھکن انکل پوجر سے استفادہ ہے، یہ ادبی استفادہ کی مثال ہے، سرقہ کی نہیں۔

عباس ازل صاحب نے "آئینہ حیرت" کی تاریخ طباعت نہیں لکھی ہیں لکھے دیتا ہوں۔ یہ کتاب محبوب المطابع دہلی میں ۱۹۴۵ء میں طبع ہوئی تھی۔ رفیق حسین صاحب کے متعلق شاہد احمد صاحب دہلوی نے "کہنے کی باتیں" میں چند جملے بطور تعارف بھی لکھے ہیں۔ اسی کتاب کو اردو اکیڈمی سندھ (کراچی) نے اپریل ۱۹۶۳ء میں "گوری ہو گوری" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اور اب کتاب کار پبلیکیشنز رامپور نے اس کو "شیر کیا سوچتا ہوگا" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ نام کتاب کے پہلے مضمون "کفارہ" کے آخری جملے سے لیا گیا ہے۔

(ذکا صدیقی)

—x—x—

ریاستی شاخ مدھیہ پردیش کا ایک جلسہ

بھوپال ڈاک سے۔

اردو کا مستقبل روشن ہے اور جو حالات اس وقت ہیں وہ اس کی ترقی اور وسعت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ان حالات کے ساتھ اردو دوستوں کے بھی فرائض اور ذمہ داریاں ہیں۔ ان کو عزم اور حوصلہ سے کام کرنا چاہیے اور ان رکاوٹوں اور دشواریوں سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ جو اردو کی راہ میں پیش آتی ہیں اس سلسلہ میں مسلسل کوشش اور جد و جہد کی ضرورت ہے اب تک کی کوششوں کے نتائج مایوس کن نہیں ہیں ان سے کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا ہے۔

یہ الفاظ اردو کے مشہور ادیب اور ماہر تعلیم ڈاکٹر سید عابد حسین نے مدھیہ پردیش ریاستی انجمن ترقی اردو کے استقبالیہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہے آپ نے بھوپال کے ادبی مقام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بے شک بھوپال کا اردو ادب کی ترقی میں اہم حصہ ہے اور اگر کسی کو اس سے اختلاف ہو تو حیرت و تعجب کی بات ہے۔

آپ نے بھوپال کی علمی ادبی اور سیاسی شخصیتوں کی خدمات اور کارناموں کو اجاگر کرنے پر زور دیا اور کہا کہ مولانا برکت اللہ بھوپالی اور دوسرے حضرات کے کام اور نام کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

شہری انجمن ترقی اردو کے صدر مسٹر ایم عرفان نے تقریر کرتے ہوئے بھوپال کی اردو خدمات کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا اور بتایا کہ بھوپال نے اردو کے سلسلہ میں بہت کام کیا ہے، آپ نے بھوپال کے مصنفین کی خدمات اور مولانا برکت اللہ بھوپالی اور دوسرے رہنماؤں کی عظیم خدمات اور قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ افسوس ہے کہ ان حضرات کے نام کی بھوپال اور بیرون بھوپال میں کوئی معمولی سی یادگار بھی نہیں بنائی گئی۔ جناب عرفان نے کہا کہ بھوپال کی اردو ادب کی خدمات کی تلاش و جستجو کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی اس وجہ سے لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ بھوپال نے اردو کے سلسلہ میں کس قدر زیادہ خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی کتنے ادیب شاعر اور صحافی اردو کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔

جناب عرفان نے جو خاکہ پیش کیا اس کے مطابق اردو کی جو کتب بھوپال سے شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد ۷۵۵ رسائل و اخبارات کی تعداد ۲۱۷ ادیب و صحافی ۱۱۰ اور ۹۷ شاعر اس وقت موجود ہیں۔ اردو مطبوعات مختلف موضوعات پر ہیں اور اکثر کافی ضخیم ہیں۔ فارسی اور عربی کی کتب ان کے علاوہ ہیں۔

جلسہ کے آغاز میں ریاستی انجمن ترقی اردو کے قائم مقام صدر جناب شرقی عثمانی نے مدھیہ پردیش میں اردو تحریک اور انجمن ترقی اردو کی خدمات پر روشنی ڈالی اور ان مشکلات اور دشواریوں کو بتایا جو اردو والوں کو پیش آتی ہیں، آپ نے مدھیہ پردیش سرکار کے سرکلر کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ اس سرکلر کے ذریعہ بھوپال سیہور رائسین برہان پور وغیرہ متعدد مقامات پر جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد پندرہ فیصدی سے اور اس سے زائد ہے (بھوپال میں ۵۰ فیصدی ہے) سہولتوں کا اعلان کیا گیا ہے۔ لیکن کئی سال گزر جانے کے باوجود اس پر کوئی عملدرآمد نہیں ہو رہا ہے آپ نے آل انڈیا ریڈیو بھوپال اندور پر اردو پروگرام کی ضرورت اردو اہمیت اور اردو میں پبلسٹی کے کاموں اور ضروری لٹریچر کی اشاعت اور پبلسٹی آفس میں اردو سیکشن کے قیام کے مطالبہ کا بھی ذکر کیا۔

آخر میں جناب شرقی عثمانی نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ہمیں آپ کے ارشادات سے روشنی ملی ہے ہم قطعاً مایوس نہیں ہیں ہماری تحریک اور جد و جہد برابر جاری رہے گی۔ بھوپال کے اردو ادب میں مقام کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ آزادی کے بعد سے برابر یہ کوشش ہو رہی ہے کہ بھوپال کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات اور مدھیہ پردیش میں اردو کی حیثیت اور مقام کو حتی الامکان کم تر کر کے بتایا جائے لیکن ہم اس ذہنیت اور کوشش کے خلاف برابر جد و جہد کر رہے ہیں، آپ نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ اردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے بھوپال کو نظر انداز کر کے بھوپال اور اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ بھوپال کی اردو خدمات کا جو خاکہ جناب عرفان نے پیش کیا ہے وہ کسی طرح کم نہیں ہے

اس تقریب میں ممتاز ادیب، شاعر، صحافی، سیاسی و سماجی کارکن پروفیسر وغیرہ شریک تھے، مشہور ناول نگار بیگم صالحہ عابد حسین اور جناب عادل رشید بھی شریک تھے۔

(سید اقتدار علی سکریٹری ریاستی انجمن ترقی اردو بھوپال)

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں راجندر سنگھ بیدی کا استقبال

علی گڑھ ۲۰ مارچ۔ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خصوصی دعوت پر اردو کے ممتاز و مقتدر افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی علی گڑھ تشریف لائے۔ ساڑھے تین بجے سہ پہر میں انجمن اردوئے معلی کی طرف سے ایک جلسہ فیکلٹی آف آرٹس کے لاؤنج میں منعقد کیا گیا جس میں علی گڑھ یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبہ

اور ادیبوں و دانشوروں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ صدرِ جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی تقریر میں بیدی صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھیں ساہتیہ اکاڈمی کا ایوارڈ ملنے پر مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ اس ایوارڈ کے ملنے سے بیدی کی فنی عظمت میں تو اضافہ نہیں ہوا لیکن اس بات کی خوشی ہے کہ یہ اعزاز ایک ایسے فنکار کو ملا ہے جو اس کا حقیقی معنوں میں مستحق ہے۔ ادبی انعامات کے سلسلے میں عام طور پر ہمارا رویہ فطری نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ اس انعام کی وجہ سے ادیب کی اہمیت اور اس کی فنی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے لگتے ہیں اور کچھ لوگ بلاوجہ تعصبات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میں سارتر کے اس جذبے کو بھی کچھ زیادہ مستحسن نہیں سمجھتا کہ ادیب کو کوئی انعام یا اعزاز قبول نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ فنکار اور قاری کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ میں اسے بھی ایک طرح کا پوز سمجھتا ہوں جو فطری نہیں ہے۔ فنکار اور قاری کے درمیان تو بہت سی چیزیں حائل ہوتی ہیں جس میں کتاب کی جلد اور گرد پوش سے لے کر پبلشر تک بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ ادبی انعام کی اہمیت دراصل یہ ہے کہ فنکار کو یہ احساس ہو کہ وہ ریگستان میں ہل نہیں چلا رہا ہے۔ بلکہ اس کا سماج اس کی قدر کرتا ہے۔

سرور صاحب نے بیدی سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں یہ بات بڑے فخر کے ساتھ آج کہہ رہا ہوں کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھیں بیدی کی پہلی کہانی پڑھ کر ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ اردو افسانے کی دنیا میں یہ ایک نئی آواز ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے غالباً "ادبی دنیا" میں جب بیدی کا افسانہ "بھولا" پڑھا تھا تو اس سے بے حد متاثر ہوا تھا اور اس کے بعد میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ان کا جب بھی کوئی نیا افسانہ شائع ہوتا تو میں اسے ضرور پڑھتا تھا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "دانہ و دام" شائع ہوا تو میں نے آل انڈیا ریڈیو کے ایک پروگرام میں اس پر تبصرہ کیا اور اس کتاب کو اردو افسانے کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس طرز کی افسانہ نگاری کو کچھ زیادہ پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ زمانہ یا تو اصلاحی اور ناصحانہ قسم کے افسانوں کا تھا یا رومانی انداز کی کہانیوں کا جس میں سنسنی خیزی ہوتی تھی، چاشنی اور چٹخارہ ہوتا تھا۔ شاعرانہ نثر اور انشا پردازی کے پینترے ہوتے تھے۔ یہ واقعہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ انھیں دنوں حکومت پنجاب کی طرف سے ایک انعامی مقابلہ ہوا جس کے ججوں میں اتفاق سے میں بھی شامل تھا۔ انعام کے لیے بہت سی کتابیں آئی تھیں۔ میں نے "دانہ و دام" کے لیے انعام کی سفارش کی تھی لیکن جب اس کا نتیجہ شائع ہوا تو پتہ چلا کہ انعام بیدی کو نہیں بلکہ حجاب امتیاز علی کو ملا ہے۔ کچھ دنوں بعد پطرس سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس کا سبب پوچھا۔ پطرس صاحب نے کہا کہ "دراصل بیدی کی زبان بہت ناقص ہے"۔ جس پر میں نے کہا تھا کہ اب تک تو یو۔ پی والے اس مرض کا شکار تھے کہ وہ ادب کو محض زبان کے پیمانے پر جانچتے ہیں لیکن آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کیونکہ ہم یو۔ پی والے تو بیدی کو اعلیٰ درجے کا افسانہ نگار سمجھتے ہیں۔

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

سرور صاحب نے آگے چل کر کہا کہ بیدی ہمارے ان فنکاروں میں ہیں جن کی شخصیت بڑی پاکیزہ ہے۔ وہ ان انسانوں میں ہیں جن سے مل کر زندگی پر ایمان تازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا ہے اور اس کی گہرائیوں تک پہنچے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی اپنی افسانہ نگاری میں فارمولے یا فیشن کو استعمال نہیں کیا۔ انھوں نے شہرت یا مقبولیت کی خاطر چونکا دینے والے اور سنسنی خیز موضوعات نہیں تلاش کیے۔ وہ نارمل اور فطری زندگی کے افسانہ نگار ہیں اس لیے ان کے یہاں جو حقیقت پسندانہ رویہ ملتا ہے اس کی مثال دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی مقبولِ عام قسم کے افسانہ نگاروں میں کبھی نہیں رہے۔ ان کے افسانوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص طرح کی سنجیدگی اور ذہنی تربیت کی ضرورت ہے۔ میں یہ کہنے میں کچھ حرج نہیں سمجھتا کہ منٹو اور عصمت گو وہ اعلیٰ پایے کے فنکار ہیں اردو افسانے پر بعض مضر اثرات چھوڑے ہیں۔ ان کے اثر سے افسانے میں کچھ بے راہ روی کا عنصر بڑھا ہے جس طرح ابوالکلام آزاد کی تقلید میں ایک غیر نثری اسلوب کو رواج ملا۔ جدید افسانے میں موضوع اور ہیئت کی جدتیں ملتی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ اپنی پٹری سے کچھ اتر گیا ہے۔ بیدی کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو افسانے کی گاڑی کو پھر اس کی پٹری پر کھڑا کیا ہے۔ ان کی کہانی "اپنے دکھ مجھے دے دو" اس کی ایک نادر مثال ہے۔ یہ افسانہ فن کا ایک معجزہ ہے۔ اسی طرح تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر ہمارے یہاں جو افسانے لکھے گئے ان میں بھی یہ بات دیکھی جا سکتی ہے کہ افسانہ نگاروں نے اپنا توازن کھو دیا ہے اور ان کا رویہ فطری نہیں ہے۔ بیدی کی کہانی "لاجونتی" اس سلسلے میں ایک استثنا کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے جس خوبصورت اور فنکارانہ انداز میں اس واقعہ کو دیکھا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ بیدی کے جس ناولٹ پر انھیں ساہتیہ اکاڈمی کا انعام ملا یعنی "ایک چادر میلی سی" وہ بیدی کی فنکاری، زندگی

کے گہرے مشاہدے اور انسانی ہمدردی و حقیقت شناسی کی بنا پر ہمارے افسانوی ادب کا ایک شاہکار ہے اور بلاشبہ ایک زندہ رہنے والا فن پارہ ہے بیدی کی رانو اردو کے افسانوی ادب کا ایک غیر فانی کردار ہے۔

سرور صاحب کی استقبالیہ تقریر کے بعد راجندر سنگھ بیدی نے حاضرین سے خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک سرور صاحب تقریر کرتے رہے میں یہی سوچتا رہا کہ میں اپنی تقریر کس طرح شروع کروں گا۔ افسانہ لکھتے وقت بھی مجھے یہی دقت پیش آتی ہے۔ اس کا پہلا فقرہ میرے نزدیک بہت اہمیت رکھتا ہے اور جب تک میں اسے پا نہیں لیتا میرا افسانہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔

بیدی نے کہا کہ میں سرور صاحب کو پچھلے پچیس سال سے جانتا ہوں وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ ہر فنکار کو ابتدا میں ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی صلاحیتوں کی پرخلوص داد دیں۔ اس سے اس کے فن کو تقویت پہنچتی ہے اور اسے اپنا راستہ تلاش کرنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ میں نے سرور صاحب کی محبت و شفقت اور ان کی ناقدانہ بصیرت سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنے تبصروں میں میرے افسانے کی خصوصیات اجاگر کیں جس کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی ان افسانوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں مجھے صحیح مشورے دیئے۔ میں ان کی اس محبت کی بے حد قدر کرتا ہوں۔

اپنے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" کے بارے میں بیدی صاحب نے کہا کہ اس میں میں نے وہ زندگی پیش کی ہے جسے میں نے بہت زیادہ قریب سے دیکھا ہے۔ یہ کہانی میرے اپنے گاؤں کی ہے اور اس کے بہت سے کردار حقیقی ہیں۔ میرے دوست ملک راج آنند نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ فن اسی وقت بلند پایہ ہو سکتا ہے جب فن کار اپنی ذات اور اپنے ماحول کے اندرون میں جھانکتا ہے اور اس کے رشتوں کی گرہ کھولتا ہے۔" میں نے ان کے اس مشورے پر اکثر عمل کیا ہے۔ میں نے دوسری زبانوں کے عظیم فن پاروں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ انھیں پڑھ کر مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوتا رہا کہ ان فنکاروں کی گرفت زندگی پر جتنی مضبوط ہے وہ بات ہمارے یہاں نہیں ملتی ہمارے ناول غیر ضروری تفصیلات اور بے معنی جزئیات کا ایک پشتارہ ہوتے ہیں اس لیے وہ ایک اکائی نہیں بن پاتے۔ ناول نگار اگر ناول کے اندر فلسفیانہ بحثیں چھیڑ دے یا علمی مسائل پر بحث کرنے بیٹھ جائے تو یہ فنی عیب ہے خواہ یہ عیب ٹالسٹائی اور رومین رولاں کے یہاں ہی کیوں نہ ہو۔ مغرب کے ناول نگاروں نے آہستہ آہستہ اس عنصر کو کم کیا ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں اب لمبی لمبی تقریریں نہیں کرتے اور پند و نصائح کے دفتر نہیں کھولتے، نہ شاعرانہ اور انشا پردازانہ لفاظی کرتے ہیں البتہ مصوری اور موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ کی نزاکتیں بہت سلیقے سے پیدا کرتے ہیں جس سے ناول کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسپننگ وے کے بعض ناولوں کی مثال دیتے ہوئے اس کی فنکاری اور مسائل حیات پر اس کی گرفت کو بیدی نے سراہا اور کہا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ اردو میں اس طرح کا ناول لکھوں جو ایک وحدت بن سکے اور زندگی سے اس کا رشتہ حقیقی اور گہرا ہو۔ "ایک چادر میلی سی" میں میں نے یہ کوشش کی ہے۔ اب ایک اور ناول لکھ رہا ہوں، جو مجھے امید ہے کہ ایک سال کے اندر مکمل ہو جائے گا۔ اس کا نام "نمک" ہے۔

اپنے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" کے بعض اقتباسات بیدی صاحب نے پڑھ کر سنائے اور خاص خاص نکات کی نشاندہی کی۔

سرور صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ "فلم سے ان کو کیا فائدہ یا نقصان پہنچا ہے" بیدی صاحب نے کہا کہ قطع نظر اس کے کہ فلم سے مجھے مالی فائدہ ہوا سب سے بڑا فائدہ میری افسانہ نگاری کو پہنچا۔ فلم ایک ایسا میڈیم ہے جس میں شاعرانہ یا انشا پردازانہ زبان یا کتابی طرز تحریر نہیں مقبول ہو سکتا یہاں زبان کو زیادہ سے زیادہ سادہ اور بول چال سے قریب رکھنا پڑتا ہے۔ میں ابتدا میں ادبی زبان لکھا کرتا تھا اور اس میں فارسی اور عربی الفاظ کی بھرمار ہوتی تھی اس لیے میں غلط زبان بھی لکھ جاتا تھا جس کی اکثر شکایت کی جاتی تھی۔ میرے مزاج کو فطری طور پر اس سے مناسبت نہیں تھی لیکن ہماری ادبی روایات ہی ایسی تھیں اور ہر ادیب یہ سمجھتا تھا کہ اسے ادبی زبان لکھنی ہے۔ حامد علی خاں، ایڈیٹر ہمایوں نے میرے بارے میں ایک بار کہا تھا "کہ بیدی کا فقرہ لکھنے سے پہلے ہی بیٹھ جاتا ہے۔" آج میں نے اس طرزت سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے اور اپنے آپ کو سادہ اور بول چال کی زبان کا پابند کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب میرے فقرے حقیقی بھی ہوتے ہیں اور ان میں جان بھی ہوتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ "اب میرا فقرہ بیٹھنے سے پہلے ہی اٹھ جاتا ہے" اور یہ فلم کی دین ہے۔

ذوقی صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ پچھلے پندرہ بیس سال میں فلم نے کیا ترقی کی ہے" بیدی صاحب نے فلمی زندگی فلم پروڈیوسروں کے طرز عمل اور ان کی تاجرانہ ذہنیت کا ذکر کیا اور کہا کہ مجموعی طور پر فلم کا فن زوال پذیر ہے۔ معیاری اور سنجیدہ فلم بہت کم بنتے ہیں کیونکہ ان فلموں سے بھی مالی منفعت زیادہ نہیں ہوتی جن پر ایوارڈ دیئے جاتے ہیں۔ فلم ساز سستی سطحی اور سنسنی خیز فلموں کے بنانے پر زیادہ توجہ کرتے ہیں۔

ایک خاتون نے ایک چادر سیلی سی لے کے ایک جملے سے متعلق اپنا یہ شبہ ظاہر کیا کہ کرداروں کا ردعمل کچھ فطری نہیں ہے، بیدی صاحب نے اس کی وضاحت کی۔

سرور صاحب نے آخر میں بیدی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

(نامہ نگار)

بزم ادب و انجمن ترقی اردو شیوپوری کا اجلاس خصوصی

شیوپوری مدھیہ پردیش، بزم ادب و انجمن ترقی اردو شیوپوری کا ایک خصوصی اجلاس جناب وشنو چرن دوبے ایڈوکیٹ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں شہر کے مشہور رہنما، شعرا، فنکار و قائدین نے وزیر اعظم شری لال بہادر شاستری، حضرت زار دہلوی اور حضرت تلوک چند محروم کے سانحات وفات پر اپنے غم کا اظہار کیا۔

جلسہ میں ڈاکٹر راجندر ناتھ ڈھینگرا، ستیہ نارائن ایڈوکیٹ، وشنو چرن دوبے ایڈوکیٹ، شفیع قریشی ایڈوکیٹ جناب چڈھا کنز اکٹر نے اپنی تقریروں میں مرحومین کے اوصاف اور ان کی خدمات کو سراہا۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی جناب خاور جبل پوری، مرادی لال برمانی، رفعت ادھیر اور رنجیت کپور نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

جلسہ میں تعزیتی تجاویز پیش کرنے کے بعد دو منٹ تک خاموش رہ کر ان کی مغفرت کی دعائیں کی گئیں۔

(سکریٹری بزم ادب شیوپوری)

نیا عہد نامہ

خلیل الرحمٰن اعظمی کا دوسرا شعری مجموعہ

"آزادی کے بعد جن شاعروں کے کلام نے اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان میں اعظمی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں اپنے لطیف اشاروں کی بلاغت کی وجہ سے اس دور کے سوز و ساز کی کتنی ہی داستانیں اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ان کی نظمیں فطرت کے حسن اور دھرتی کی بو باس کے ساتھ کتنے ہی زخموں کے چمن بھی لیے ہوئے ہیں۔ فیشن یا نعرہ بازی سے ہٹ کر اعظمی نے معنی خیز اور قابل قدر شاعری کی ہے۔"

(پروفیسر آل احمد سرور)

قیمت چار روپے ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ

صفحہ ۹ سے آگے

بھی تھا، ان کے تقریری و تحریری افادات عالیہ سے کیوں محروم رہے، ہمیں امید ہے، کہ سالگرہ کمیٹی، ان کی تقریروں کے اردو مجموعہ کی اشاعت کی طرف بھی توجہ کرے گی، اور جلد سے جلد اس کو منظر عام پر لائے گی، ہم ان کو، اردو ہی کا خدمت گذار، معتبر، اور صحافی سمجھتے ہیں، اور ہم کو ان کی اردو کی خدمات پر فخر ہے، اردو کا کوئی مورخ، پنجاب میں اردو کی نشر و اشاعت کی تاریخ لکھتے وقت ان کو فراموش نہیں کر سکتا، اپنی سیاسی و قومی زندگی کے ہر دور میں ان کا تعلق اردو سے رہا ہے، اور وہ انگریزی کے بعد، اس میں لکھتے پڑھتے رہے ہیں، یوں افادۂ عام کے خیال سے ان کی تقریریں، ہر زبان میں شائع کی جا سکتی ہیں، اور کی جانی چاہئیں، کہ وہ آل انڈیا لیڈر تھے، اور کانگریس کے ایک بڑے اور ممتاز لیڈر کی حیثیت سے، راس کماری سے پشاور تک ہندوستان کی تمام زبانوں کے بولنے والوں کو ان سے عقیدت اور محبت تھی، لیکن بہرحال اردو کا حق، جو ان کی زندگی میں ہندوستان کی سب سے بڑی زبان تھی، ان سب سے فائق ہے، اور ہم اپنے ان تاثرات کے ذریعہ اسی کی طرف سالگرہ کمیٹی کو توجہ دلانا چاہتے ہیں، اس سلسلہ میں وہ جو خدمات انجام دے رہی ہے، اس کی ہمارے دل میں بڑی قدر ہے، اور ہم اس پر صدق دل سے مبارکباد دیتے ہیں، لیکن اردو والوں کا جو حق لالہ لاجپت رائے پر ہے، اس کا سالگرہ کمیٹی کو ضرور لحاظ کرنا چاہیے، اور وہ محض ان کی اردو تقریروں کے مجموعہ کی اشاعت ہی پر اکتفا نہ کرے گی، بلکہ اردو میں ان کی مفصل سوانح عمری بھی شائع کرے گی، گاندھی جی گنگا دھر بال تلک، جواہر لال وغیرہ کا سارا قومی و سیاسی لٹریچر اردو میں منتقل ہو چکا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ انہی بزرگوں کے برابر کے ان لیڈر اور رہنما کا بھی، جنھوں نے بہت کچھ لکھا ہے، سب اردو میں آ جائے اور اردو بولنے والوں تک پہنچ جائے، صدق جدید میں مولانا عبد الماجد دریابادی نے اپنے مخصوص اور موثر طرز انشا میں اسی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپایا اور نذیر حسن پبلشر نے مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا